بشیر احمد ڈار

فلسفہ کیا ہے؟

ایک آدمی نے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا تھا کہ نثر کیا چیز ہوتی ہے۔ جب اسے جواب دیا گیا کہ نثر تو وہی چیز ہے جو آپ روزمرہ بولتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ سن کر وہ حیران رہ گیا۔ شاید ایسی ہی تعجب آمیز کیفیت اس شخص کی ہوگی جس کو کہا جائے کہ تم خود فلسفی ہی تو ہو۔ اور پھر پوچھتے ہو کہ فلسفہ کیا ہے۔ فلسفہ درحقیقت اس کیفیتِ ذہنی کا نام ہے جو ہر انسان کو کسی حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ ہمارے حواس، ہمارا جذبہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت، ہمارا سونا، پھرنا، چلنا اور آرام کرنا، یہ تمام اعمال اگرچہ حیوانی درجے سے کمیت کے لحاظ سے مختلف ہوں گے مگر کیفیت کے لحاظ سے ہم ان کی وجہ سے حیوانوں سے بلند تر نہیں۔ اگر کوئی چیز مابہ الامتیاز کہی جا سکتی ہے تو وہ احساسِ خودشناسی اور خودنگری ہے جو انسان کا اصلی جوہر ہے اور یہی خودنگری ہے جو انسان کو اپنے مادی ماحول اور انسانی معاشرے کے مختلف مسائل پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہر شخص خواہ وہ محسوس کرے یا نہ کرے اس حیثیت میں فلسفی ہے کہ اُس نے ان مسائل کو سوچا ہے اور ان کے متعلق کچھ رائیں اور نظریات غلط یا صحیح قائم کر رکھی ہیں۔ اس کے نزدیک چند اقدارِ حیات ہیں جن کا مبہم یا واضح تصور اس کے ذہن میں موجود ہے اور جن کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کے تاریک اور روشن پہلوؤں پر نظر ڈالتا رہتا ہے۔ مثلاً مذہبی زندگی میں خدا کے وجود کا اقرار یا انکار۔ حیاتِ بعد الموت کا تصور، اخلاقیات میں خیر و شر کا معیار اور اس کے مطابق عملی زندگی میں چند اصولوں کی پیروی، سیاسیات میں جمہوریت یا اشتراکیت، نسلی اور قومی برتری یا مساوات یا علمی دنیا میں مختلف نظریات متعلقہ ارتقا، سکون و ثبات وغیرہ وغیرہ۔

یہیں سے خالص فلسفہ کی حدیں دیگر مختلف علوم سے متمیز ہو جاتی ہیں۔ علم الحیات کا موضوع زندگی ہے۔ علم طبیعیات کا موضوع مادہ اور اس کے متعلقہ تصورات زمان و مکان، علت و معلول وغیرہ ہیں۔ عمرانیات کا موضوع انسانی معاشرت اور اس کے متعلقہ مسائل ہیں اور نفسیات کا موضوع نفسِ انسانی اور اس کے مختلف اعمال ہیں۔ ہر علم اپنے موضوع کو ایک مسلّمہ حقیقت سمجھ کر اسے زیرِ بحث لاتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علم کی تحقیقات دوسرے علم کے متناقض نظر آتی ہیں۔ چونکہ انسانی زندگی ایک اکائی ہے جس کے مختلف پہلو آپس میں مربوط اور منسلک ہیں۔ اس لیے مختلف علوم کے ان تمام نتائج کو ایک واحد نظریہ کی شکل میں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور یہی فلسفہ کا کام ہے۔ اور، زندگی اور نفس جو تین مختلف سائنسوں کے مفروضات ہیں، ان تینوں کو مشترکہ طور پر زیرِ بحث

لہٰذا اور ان کا باہمی تعلق واضح کرنا فلسفہ کا موضوع ہے اسپنسر نے اسی پر کہا تھا کہ "سائنس جزوی مربوط علم ہے اور فلسفہ کلی مربوط علم۔"

لیکن فلسفہ کا یہ دعویٰ کمالِ علم ہی بعض محققین کی نگاہ میں کھٹکتا ہے۔ چنانچہ افلاطون اور ارسطو پر جو فلسفہ کے اولاً بانی تصور کئے جاتے ہیں یہی اعتراض کیا جاتا رہا کہ وہ دیوتاؤں کے سے علم کے خواہشمند ہیں۔ ان کا جواب صرف وہی تھا کہ وہ فلسفی ہیں۔ یعنی دانائی کے شیدا۔ ارسطو نے کہا کہ انسانی عقل نورِ خداوندی کا پرتو ہے۔ اور اس لیے مختلف مسائل کی عقلی توجیہہ کی کوششیں بلاشک وشبہ خدائی علم سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اور شاید یہی انسانی فطرت کا صحیح تقاضا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسانی علم اپنی گہرائی اور وسعت کے لحاظ سے خدائی علم تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اور بالکل بجا بھی ہے۔ آں حضرتؐ کے متعلق مروی ہے کہ آپ دعا مانگا کرتے تھے کہ خدایا مجھے اشیا کی حقیقت سمجھنے کی توفیق فرما۔ اور اشیاء کی حقیقت کا علم ہی وہ کلی علم ہے جس کے بغیر انسان اپنے روزمرہ کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پا سکتا۔ ایک مصور اپنے قلم کو حرکت دینے سے پہلے اپنی تصویر کا ایک کلی خاکہ اپنے ذہن میں قائم کرتا ہے۔ ایک افسانہ نویس کے قلب پر اسی طرح مکمل افسانے کا نقشہ مع کرداروں کے منعکس ہوتا ہے۔ اور یہی مکمل تصویر بعد میں ان کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تفصیلات میں جاتے ہوئے مصور اور ادیب کا ذہن اولین خاکہ سے کہیں کہیں تجاوز کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یہ تمام کمی بیشی اس ابتدائی کلی تصور کی چاردیواری میں محدود ہوتی ہے۔ آپ فلسفہ کو اس کلی تصور سے مشابہت دے لیجیے جو ہر شخص اپنے ذہن میں اس کائنات کے متعلق قائم کرتا ہے۔ علم اور تجربہ سے اس تصور میں کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ تبدیلی بھی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن انسانی ذہن کچھ اس ساخت کا ہے کہ اس تصور کے بغیر اس کی زندگی کچھ بدمزہ اور بیکار سی معلوم ہوتی ہے۔ گھر کی چاردیواری اس کے خاندانی افراد سے تعلقات، سوسائٹی میں دوستوں اور عزیزوں سے راہ و رسم، سیاسی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں اور فرائض، بین الاقوامی مسائل میں اس کے پسندیدہ نظریات۔ سبھی اس کلی تصورِ حیات کے مختلف پہلو ہیں جو مخصوص شخصی اور ثقافتی رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے مختلف مسائل اس کے سامنے آتے ہیں وہ ان ابدی سوالات کا جواب جو انسانی فطرت پیدا کرتی رہتی ہے اس کلی تصور کی روشنی میں تلاش کرتا رہتا ہے۔ خواہ یہ جوابات وقتی اور عارضی ہوں یا مستقل۔ آپ ایک بظاہر معمولی سا سوال لیں: آپ کہاں ہیں؟ اس کا جواب تمام کائنات کی مکانی نوعیت کے ایک کلی تصور پر مبنی ہے۔ پس فلسفی سوالات پر سوچنا اور ایسے سوالات کا کلی یا جزوی صحیح جواب تلاش کرنا صرف دیوتاؤں سے مخصوص نہیں اور نہ صرف ان چند انسانوں سے جو عام طور سے تاریخ فلسفہ کی کتابوں میں فلسفیوں کے مقدس نام سے پکارے جاتے ہیں۔ بلکہ ہر ذی فہم اور غور و فکر انسان کا اہم اور لازمی فریضہ ہے۔ یہ خدائی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں انسانی ضرورت ہے۔

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ تصورات خالص عقلی اور ذہنی راستوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہم میں اکثر انسان ایسے ہوں گے جنھوں نے کبھی عقلی طور پر ان نظریات تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ عام طور پر اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے سنی ہوئی باتیں ہم بلاچون وچرا قبول کر لیتے ہیں۔ اور بعض میں معاشرے کی ثقافتی روایات ان کو استوار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اسی طرح ہمارا ادبی ذخیرہ نظم، افسانے، ڈرامے بھی ان مفروضات و اعتقادات کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان اعتقادات کی جو ہمیں گویا وراثتاً یا روایتاً حاصل ہوتی ہیں، عقلی توجیہ کرنی شروع کرتے ہیں۔ اور مختلف دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حقیقی تصورات ہیں۔ انگریز فلسفی بریڈلے کا قول ہے کہ الٰہیات کا کام درحقیقت ایسے ہی اعتقادات کے لیے صحیح یا غلط دلائل مہیا کرنا ہے جن کو ہم محض جبلّی طور پر تسلیم کرتے ہیں اگرچہ یہ عمل بھی یعنی دلائل تلاش کرنا خود ایک فطری امر ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان دلائل کو غلط بھی ٹھہرا دے اور ان کے خلاف معقول وجوہات بھی پیش کر دے تاہم اکثر حالات میں ہم ان تصورات سے چمٹے رہتے ہیں اور پرانے دلائل کی بجائے نئے دلائل تراش کر اپنے نفس کو تسکین دے لیتے ہیں۔

فلسفہ ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ ہم اپنے تمام معتقدات خالص عقلی دلائل کی بنیاد پر قائم کریں کیونکہ انسانی فطرت محض عقل نہیں بلکہ بیشتر جذبات پر مبنی ہے۔ نہ یہ توقع کرتا ہے کہ ہم ان معتقدات کو ترک کر دیں جن کے لیے ہمارے پاس بظاہر کوئی عقلی توجیہہ نہیں۔ اس کا کام صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ معتقدات قائم ہیں اور آیا یہ وجوہات صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ بعض فلسفیوں کے نزدیک مذہب اور فلسفہ کا فرق یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد نقل (Authority) پر ہے اور فلسفہ کی بنیاد عقل پر لیکن یہ تفریق محض نظری ہے عملی نہیں کیونکہ خود فلسفہ میں بھی نقل کے بغیر گذارہ نہیں۔ اگرچہ ہمیں صحیح اور غلط نقل میں فرق کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ بعض دفعہ ہم عقل کی بجائے وجدان پر بھی بھروسہ کرتے ہیں۔ گو یہاں بھی صحیح اور غلط وجدان کا فرق اسی طرح ناگزیر ہوگا جس طرح کہ صحیح اور غلط استدلال کے لیے کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں عقل انسانی کے حدود کا تعین ضروری ہو جاتا ہے۔ غرض ہم کسی نتیجے پر پہنچیں۔ اتنی بات تو کم از کم ہر شخص محسوس کرے گا کہ انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کسی عقیدہ کے متعلق یہ کہہ کر اپنے آپ اور دوسروں کو مطمئن نہیں کر سکتے کہ ہم نے یہ عقیدہ بغیر کسی عقلی توجیہہ کے قبول کیا ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ فلسفہ اور اس کے مسائل پر سوچنا اور ان کا حل تلاش کرنا اسی طرح انسانی فطرت کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس طرح کھانا یا پینا۔ خواہ ہم کتنی ہی کوشش کریں ہم انسانی مسائل کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ اس کا بہت قوی احتمال ہے کہ ہم اپنی عقل خداداد سے صحیح راستے کو پالیں۔ سقراط نے خوب کہا تھا کہ ایسی زندگی جس میں اہم امور پر غور و فکر مفقود ہو صحیح انسانیت کے مقام سے بہت پست ہوگی۔ اس حقیقت کبریٰ کو قرآن مجید نے

یوں بیان کیا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ سوچتے نہیں یہ حیوان ہیں بلکہ اس سے بدتر۔

اکثر سننے میں آتا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجاز کی منزل سے گزرنا لابدی ہے۔ لیکن کیا یہ ظاہر حقیقت کا صحیح پر تو ہیں؟ کیا ظاہریت کا یہ تمام بکھیڑا ایک پردہ تو نہیں جس کے پیچھے حقیقت اپنا صحیح چہرہ چھپائے ہوئے ہے؟ زمین اور ستاروں کا سکون کیا حقیقت کی طرف رہنمائی ہے یا گمراہی؟ آپ کسی چھڑی کو پانی میں ڈالیں تو وہ ٹیڑھی نظر آنے لگتی ہے۔ مگر اس کا سیدھا ہونا حقیقت ہے یا اس کا ٹیڑھا ہونا؟ شاید ان میں سے بعض نتائج کا فیصلہ علم طبیعات یا علم ہیئت کر دے۔ لیکن پھر چند زیادہ اہم سوالات سامنے آتے ہیں۔ موت انسانی زندگی کو ختم کر دیتی ہے؟ کیا واقعتاً ایسا ہی ہے؟ ہمارا دل گواہی دیتا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے افعال میں مختار ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے؟ یہ کائنات مختلف نوع کی اشیاء کا ایک مجموعہ نظر آتی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے۔ یا یہ کسی شئے واحد کے مختلف النوع مظاہرات ہیں؟ یہ اور اسی قسم کے مختلف سوالات فلسفہ کے خاص موضوعات ہیں۔

اگر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ شاید دو چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم میں سے ہر شخص صحیح معنوں میں حقیقی سمجھتا ہے۔ ایک تو وہ تمام اشیاء جو خارجی دنیا میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً اینٹ، پتھر، درخت۔ دوسرے ذہنی تجربات مثلاً دانت کے درد کا احساس۔ بعض دفعہ چٹان کا وجود بالکل حقیقت معلوم ہوتا ہے اور حقیقت کی مثال دینے کے لیے کہتے ہیں کہ ایک ایسا قائم بالذات جیسا کہ پہاڑ لیکن بعض حالتوں میں درد کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ شاید خود پہاڑ کی حقیقت اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایسے مختلف قسم کے ذاتی تجربات کی بنا پر مفکرین نے دو مختلف نظریات قائم کیے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک مادی دنیا اور اس کے تقاضے صحیح معنوں میں حقیقت ہیں اور نفس کی دنیا محض اس کا پر تو ہے اور اس کی روشنی میں اس کی تشریح ہو سکتی ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک حقیقت مادی نہیں بلکہ نفسی یا ذہنی ہے اور کائنات کا تمام مادی اور خارجی پہلو انسانی نفس کی پیداوار ہے۔ پہلا گروہ مادیین کا ہے۔ مارکسی اشتراکیت اسی نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ تمام مختلف نظریات شامل ہیں جن کو تصوریت ([illegible]) کہا جاتا ہے۔ ان دونوں مختلف نظریات کے علاوہ ہم یہ مفروضہ بھی پیش کر سکتے ہیں کہ حقیقت ان دونوں سے ماوراء ہے اور مادہ اور نفس اس کے دو پہلو ہیں جیسا کہ سپنوزا کا خیال ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مادہ اور نفس دونوں اپنی اپنی جگہ حقیقی ہیں اور یہ کائنات انہی دونوں کے تصادم کی مظہر ہے۔ اس کی تاریخی مثال ایرانی فلسفی مانی کی ثنویت ہے جس کے نزدیک یزدان اور اہرمن دو قائم بالذات اور ازلی حقیقتیں ہیں۔ کیا یہ سوالات محض بیکار ہیں؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ آپ اپنی زندگی اور اس کے مسائل سے کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کائنات کے پر پیچ مظاہر سے آپ کو کتنی وابستگی ہے۔ یقیناً "یہ دنیا جس میں آپ اور ہم سبھی مل کر زندگی گزار رہے ہیں ایسی نہیں کہ اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور ان چٹکیوں کو جو کبھی کبھار ہمارے دل میں لی جاتی ہیں بغیر محسوس کئے چھوڑ دیا جائے لیکن فلسفہ

کی کائنات صرف میری چند نظری مباحث نہیں۔ اس میں ہماری عملی زندگی کے کئی اہم مسائل بھی شامل ہیں یعنی اقدارِ حیات صحیح و غلط، اچھائی اور برائی کے اقدار۔ کبھی کبھی انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی جس میں بظاہر تلخیاں اور پریشانیاں راحتوں کے مقابلے میں زیادہ معلوم ہوتی ہیں اس قابل ہے کہ اس کو جوں توں کر کے گزارا جائے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ موت کا ایک کڑوا گھونٹ پی کر چند روزہ مصائب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے؟ زندگی کا یہ پہلو مشرقی فلسفہ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اور اس کی بنیاد شاید اس مفروضہ پر معلوم ہوتی ہے کہ مادہ اور روح میں کوئی مماثلت نہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ لیکن اگر اس نظریہ کو ایک طرف کر دیا جائے اور کائنات کا تصور یہ ہو کہ اس میں مادہ اور روح دونوں بجائے تخالف کے توافق کے راستے پر گامزن ہیں تو زندگی کا ثبوتی پہلو سامنے آجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باوجود انتہائی تکالیف کے اس میں چند ایسے امکانات موجود ہیں جن کی مدد سے انسان کائنات میں اپنے وجود کی افادیت کو پورا کر سکتا ہے اور شر کے باوجود خیر کا اکتساب کر سکتا ہے۔ خیر اور شر یا نیکی اور بدی کے کیا معیار ہیں؟ کیا یہ ہمیشہ یکساں رہتے ہیں یا زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟ یہ آواز اکثر سنائی دیتی ہے کہ اپنے تصورات اور نظریات بدلتے ہوئے زمانے اور معاشرے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ سیاست اور قانون، مذہب اور اخلاق، ادب و فن، غرض ہماری ثقافتی زندگی کا ہر پہلو اس تغیر سے متاثر نظر آتا ہے۔ لیکن اس ہمہ گیر تغیر کے باوجود چند ایسے ابدی اصول ضرور موجود ہیں جن کی روشنی میں اشیاء کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جن پر انسانی اور خارجی فطرت بھی گواہی دیتی ہے، جو اپنے بنیادی تصورات کے لحاظ سے ازلی اور ابدی ہیں۔ گو زمانے کے تغیرات کے ساتھ ان کی عملی توجیہ میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ رونما ہوتے رہیں۔ ان سوالوں کا جواب یقیناً ہر زمانے میں دیا جاتا رہا ہے اور اس طرح ہمارے موجودہ دور میں یہ سوالات ہر ذی فہم انسان سے جواب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہی وہ مسائل ہیں جن کا جواب دینا فلسفہ کا ایک موضوع ہے۔

لیکن ان سب سوالات کے ساتھ ساتھ انسان کے قلب میں بعض دفعہ یہ خیال ابھرتا ہے کہ کیا وہ ان مسائل کا صحیح حل معلوم کر سکتا ہے؟ کیا انسانی عقل اور ذہن اس قابل ہے کہ کائنات اور انسانی زندگی کی اس گتھی کو سلجھا سکے؟ یہ شکوک و شبہات انسان کی خود نگری اور فلسفیانہ مباحث سے دلچسپی کا شاندار مظہر ہیں کیونکہ اگر یہ شبہات دل میں پیدا نہ ہوں تو فکر و فلسفہ کی زندگی کا آغاز ناممکن ہو جاتا ہے۔ پس ان شبہات کو دور کرنا اور ان سے پیدا شدہ سوالات کا جواب دینا بھی فلسفہ ہی کا موضوع ہے جس کو اصطلاحی زبان میں Epistemology کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک گروہ خالص عقلیت کا پرستار ہے جس کے نزدیک انسانی تعقل اس قابل ہے کہ زندگی کے مسائل کو عمدگی سے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک انسانی تجربہ جس میں مشاہدہ اور قیاس شامل ہے عقل محقق کے مقابلے میں زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ ایک تیسرے گروہ کے نزدیک عقل اور تجربہ سے بالاتر وجدان کا درجہ ہے۔ جس کا دوسرا سرا وحی سے جا ملتا ہے اور اس طرح فلسفہ اور مذہب ایک ہی تصویر کے دو رُخ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔